رضا علی عابدی کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر شاہدہ رسول/ ڈاکٹر محمد اشرف کمال

Abstract:

The short story has its origins in the West and our writers has used as a source to describe romantic, realistic, cultural and social attitude and for depicting the psycho of the individuals of the society. This genre of literature is extremely popular since its beginning. The basic reference of identity of Razza Ali Aabadi is his travelogues broadcasted from BBC that have been published in the form of a book. He has also written short stories. Here we will ponder over his collections of the short stories "Apni Awaz" and "Jan Sahib" in order to mitigate in totality his expressed reservations in this regard. Importantly, his short stories has not been as popular as his travelogues .

رضا علی عابدی کی بنیادی شناخت بی بی سی اُردو سروس میں براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ہے تاہم انہوں نے افسانے بھی لکھے۔اُن کے دو افسانوی مجموعے ''اپنی آواز'' اور ''خان صاحب'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانوں کا موضوع نچلے طبقے کی زندگی اور اس کے مسائل ہیں۔رضا علی عابدی نے بچوں کی چہکار سے لے کر سیاست دانوں تک کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ایک کہانی بننے کے لئے کہانی کار عموماً یا تو تخیل سے کام لیتا ہے یا اپنے مشاہدے کو تخلیقی تجربہ بناتا ہے۔ کبھی وہ شہری فضا کو موضوع بناتا ہے اور کبھی دیہاتی ماحول کو۔لیکن بڑا ادب ان سب دائروں کی قید سے باہر ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''بڑا ادب ذاتی کے بجائے غیر ذاتی، زمانی کے لحاظ سے دوامی اور غیر فانی موضوعی کے بجائے معروضی اور خواب گوں کے بجائے حقیقی ہوتا ہے۔''(۱)

رضا علی عابدی کے افسانوں میں ہر چند کہ متوسط طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اگر کہانی کار کا مشاہدہ وسیع ہو تو وہ بالائی طبقوں میں بھی ایسے مکینوں کو تلاش کر سکتا ہے جو اونچے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود متوسط طبقے یا نچلے طبقے کے افراد جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن رضا علی عابدی کے افسانوں میں ہمیں تقریباً ایک جیسا ماحول ملتا ہے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے نچلے یا متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، لکھتے ہیں :

> ''اپنے برصغیر کے طول و عرض کے دوروں میں جو کام میں نے دل لگا کر کیا وہ یہ ہے کہ میں نے تاریخی عماتوں اور حسین منظروں سے زیادہ ان عمارتوں کے پچھواڑے اور ان منظروں کے پرے رہنے والے انسان کو قریب جا کر دیکھا ہی نہیں اسے محسوس کیا۔ اسے جانا ہی نہیں اسے سمجھا۔ اس نے تو صرف مجھے دل میں بٹھایا میں نے اُسے اپنے شعور کے نہاں خانے میں بٹھا دیا۔ اب سر اور تال میرے ہیں اور سنگت اس کی۔۔۔۔''(۲)

رضا علی عابدی کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی پریم چند کی طرح سورج مکھی کے پھول سے گلاب کی خوشبو کشید کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ تخلیقی کرب جو پریم چند کے افسانوں میں نظر آتا ہے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ رضا علی عابدی نے ہمارے معاشرے کے درد ناک پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ وہ مسائل جو ہمارے جانے پہچانے ہیں اُن کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ رضا علی عابدی کے افسانوں میں ایک بات جو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے محض مسائل یا ان مسائل میں گرفتار لوگوں کی بات نہیں کی بلکہ پس پردہ ان لوگوں کے بھیانک چہروں سے بھی نقاب اٹھایا ہے جو ہمیشہ سے معصوم اور مظلوم لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً ضعیف الاعتقادی دیہات کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر رضا علی عابدی نے بہت اعلیٰ افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار کی نظر صرف لوگوں کی ضعیف الاعتقادی پر نہیں رہتی بلکہ اس کے پردے میں جو لوگ استحصالی کردار ادا کر رہے ہیں افسانہ نگار ان کرداروں اور ان کے طریقہ واردات کو بغور دیکھنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے مثلاً:

> ''اس رات شانتی کے سر سے جن اتارا گیا تو شاہد خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جس وقت لعل شاہ کو ہانڈی میں بند کیا جا رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد علی نے لڑکی کو پکڑ کر کس طرح اپنے

سینے سے لگا رکھا ہے۔ لڑکی کے نرخرے سے مردانہ آوازیں نکل رہی تھیں تو اُسے صاف نظر آ رہا تھا کہ حامد علی کا ہاتھ لڑکی کی کمر کے گرد ہوتا ہوا کہاں تک پہنچ رہا ہے۔'' (۳)

رضا علی عابدی نے تجریدی ادب کی مخالفت کی اور علامتی افسانے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا کہتے ہیں:

''علامتی انداز میں کہانیاں لکھنا میرے بس کا کام نہیں مجھے پتہ ہے کہ اگر میں اس طرح کا ادب لکھوں گا تو اوندھے منہ گروں گا۔''(۴)

لیکن ''اپنی آواز'' میں جو انہوں نے ایک دو علامتی افسانے لکھے وہ اُن کی خوب صورت تخلیقات میں سے ہیں۔ گویا یہ کہانیاں کہانی کار کے اس دعوے کی تردید کرتی ہیں کہ وہ علامتی ادب نہیں لکھ سکتے۔

فنکار معاشی اور سماجی ناہمواری اور ذاتی و اجتماعی کرب کو جس طرح نفسیاتی پیرائے میں بیان کرتا ہے تو کئی علامتیں وجود مین آتی چلی جاتی ہیں۔ علامتی افسانے کے بارے میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''علامت خیال کی سب سے بڑھ کر آپ رُوپی صورت ہے۔''(۵)

ان کہانیوں میں انہوں نے اس صورت حال کا بڑی خوبصورتی سے جائزہ لیا ہے کہ ضعیف الاعتقادی کے مارے ہوئے لوگوں کو صرف وہ لوگ ہی اپنے قدموں تلے نہیں روندتے جن کے یہ عقیدت مند ہوتے ہیں بلکہ ارد گرد کے موقع پرست لوگ بھی ان کی مجبوری اور معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رضا علی عابدی کا ایک افسانہ ''شاہ صاحب کا کمال'' اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں افسانے کی ہیروئن ''رانی'' کے ہاں اٹھارہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اٹھارہ سال بعد جب اعجاز جو اکرم کا دوست ہے۔ اسے ایک پہاڑی والے شاہ صاحب کی کرامات کے قصے سنا کر وہاں تک لے جاتا ہے اور پھر دشوار گزار راستوں میں وہ رانی کے شوہر کی عدم موجودگی میں اس کا ساتھ دیتا ہے اور یوں اٹھارہ سال بعد رانی اور اکرم کے آنگن میں پھول کھلتا ہے۔(۶)

رضا علی عابدی کے ایسے موضوعات پر لکھے گئے افسانوں میں درد مندی اور سوز موجود ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے افسانہ نگار نے ان ساری خرابیوں کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے تبھی تو وہ ان مسائل تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ اپنے مخصوص اسلوب میں ان مسائل کے حل کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں کہ یہ ضعیف الاعتقاد لوگ اگرچہ اس خول سے باہر نہیں نکلے تاہم اگر ارد گرد کے باشعور لوگ ان کی مجبوریوں کو خریدنے کی بجائے اُن کے ذہن کی تربیت کریں تو یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو کبھی حل نہ ہو سکے۔

افسانہ ''ونیبلہ ٹی زیرو'' میں اسی خیال کا پرتو ملتا ہے کہ جب ان بنجر ذہنوں کی آبیاری کرنے کے لئے کوئی آتا ہے تو یہ ذہن نہ صرف اس تبدیلی کو قبول کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے اندر جزب بھی کر لیتے ہیں مثلاً جو ٹیلہ گاؤں والوں کی خام خیالی کی وجہ سے ہمیشہ سے بنجر تھا۔ اس پر نحوست کے سوا کچھ نہیں اگتا تھا جب اس کی نحوست گاؤں والوں کے دلوں سے دور ہوئی یا دوسرے لفظوں میں ان کے ذہن کو بالیدگی کی فضا ملی تو وہی ٹیلہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔(۷)

جب افسانہ نگار کی نظر معاشرے میں پھیلی ہوئی بے روزگاری پر پڑتی ہے تو اس معاشرے کو بھی وہ تخلیق کا حصہ بناتا ہے لیکن یہاں ہمیں ان کی تخلیق میں وہ کرب محسوس نہیں ہوتا جو فی الواقع بے روزگار لوگوں کو سہنا پڑتا ہے بے روزگاری کے نتیجے میں لوگ گداگر اور نجومی بن جاتے ہیں یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے۔ ایسی بات جس سے نہ ہماری آنکھیں آشنا ہیں، نہ کان یہ بات اتنی ہی سادگی سے اگر افسانوں میں بھی آئے گی تو پڑھنے والا کہیں بھی ء ملویت یا ترفع محسوس نہیں کرے گا۔ بلکہ ان افسانوں کو پڑھ کر وہ بالکل اسی طرح بند کر دے گا جیسے بہت سے بے حس لوگ بڑی بڑی ہولناکیوں کو دیکھ کر بھی سکون سے ان مقامات سے گزر جاتے ہیں۔ کسی فنکار کے لیے موضوع کے ساتھ ساتھ وسیع کینوس کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

> ''فن کاروں کے فن میں ان کے کینوس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو وسیع پیمانے پر لیتے ہیں، زمین آسمان، انسان، زمانے، ہر شے صدیوں پر پھیلی اور وقت کے بہاؤ میں شامل ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو باریک بینی سے کام لیتے ہیں گویا چاول کے دانے پر قل ھو اللہ لکھتے ہیں، یا' منی اے چر' بناتے ہیں۔''(۸)

رضا علی عابدی بھی اسی قسم کے تخلیق کار ہیں جس طرح انھوں نے متنوع جہات میں لکھا ہے اسی طرح افسانہ نگاری میں ان کا تخلیقی کینوس وسیع ہے۔ رضا علی عابدی کے افسانوں کا کینوس محدود نہیں ہے بلکہ متنوع ہے۔ رضا علی عابدی کے افسانوں میں مختلف مسائل کی عکاسی کی گئی ہے کہ بے روزگار انسان پہلے تو شرافت سے روزگار تلاش کرتا ہے لیکن روزگار نہ ملنے پر وہ گداگری اور علمِ نجوم کو اپنا ذریعہ معاش بنالیتا ہے۔ ان کے ایسے افسانوں میں ''مہر جو اُس کی ہووے''، ''میرا بچہ'' اور ''دری'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مسائل بچوں کی سائیکی پر اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً جب تھکے ہارے مرد شام کو ناکام و مایوس لوٹتے ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنے بچوں اور گھر کے دوسرے افراد پر نکالتے ہیں۔ پھر بسا اوقات ان کی اپنی شخصیت بھی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے کو بے روزگاری شاید اتنا نقصان نہ پہنچاتی جتنا جھوٹی انا اور وضع داری نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ احساس تفاخر میں لوگ اول تو کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اگر ہو بھی جائیں تو معاشرے سے اس طرح چھپ چھپ کے کرتے ہیں جیسے مجرم۔ افسانہ ''وہاٹ از یور فادر'' اسی المیے کا افسانہ ہے۔ بنیادی طور پر رضا علی عابدی انسانیت سے پیار کرنے والے ہیں۔ انہوں نے بہر حال محبت سے ان تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مشاہدات کو تخلیقی تجربہ بنایا ہے۔ سیدہ تحسین فاطمہ لکھتی ہیں:

> ''عابدی صاحب زندگی سے محبت کرتے ہیں اور ان کی ساری کی ساری تحریریں اس کی ترجمان ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے سنجیدہ معاملے کو سہل، سادہ اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔''(۹)

رضا علی عابدی کے افسانوں کے موضوعات عام طور پر گھریلو زندگی اور اس کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں مغرب کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان کے افسانوں کے اسی پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔ان (رضا علی عابدی) کے بیانیہ میں رچے بسے کلچر کی گھریلو بو باس اور مٹی کا سوندھا پن ہے کہیں کہیں مغرب کے شگوفوں کے رنگ اور بچوں کی چہکار بھی ہے۔ لیکن جو کچھ ہے انسانیت کے سنہرے فیتے سے بندھا ہوا ہے۔۔۔۔''(۱۰)

دور حاضر میں ہر طرف ایک عجیب و غریب افراتفری ہے۔ ہر انسان نفسا نفسی کا شکار ہے ایسے میں جب کوئی افسانہ نگار کسی کی محرومیوں کا ذکر کرے گا تو وہ سنسنی پھیلانے کی بجائے اگر براہ راست مگر رسیلے لہجے میں اپنی بات لوگوں تک پہنچائے یعنی نیش کو نوش بنا کر پیش کرے تو اس کے افسانے زیادہ اثر پذیر ہوں گے، چاہے وہ افسانے کسی الم ناک اور سنگین صورت حال کا احاطہ ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔

افسانہ اگر دل کا تار چھیڑے بغیر صرف تلاطم ہی برپا کرے تو وہ اخبار کے کسی اداریے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ رضا علی عابدی اس گر سے خوب واقف ہیں کہ نیش کو نوش کس طرح بنایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک افسانے کی تعریف یہ ہے:

> ''افسانہ وہ پتھر نہیں جسے جوہڑ میں اچھالا جاتا ہے۔ افسانہ وہ کنکر ہے جسے ساکت و ساکن جھیل میں آہستہ سے پھینکا جاتا ہے۔''(۱۱)

عابدی صاحب کے افسانے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ موجودہ زندگی سے بیک وقت لطف بھی اٹھاتے ہیں اور کڑی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ نہ صرف دیکھتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچتے ہیں اور ہمیں سوچنے پر اکساتے ہیں۔ بقول ان کے:

> ''خیالات مجھے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں میں چاہتا ہوں میرے پڑھنے والے بھی سوچنے پر مجبور ہوں۔ ہم سب مل کر سوچنا سوچنا کھیلیں ۔ ہم سب چور بنیں اور خود کو ڈھونڈیں۔''(۱۲)

رضا علی عابدی کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی حرکات و سکنات، ان کی لاشعوری خواہشات، ان کے محسوسات اور ان کی سائیکی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ روز مرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر سوچتے ہیں اور ہلکے پھلکے انداز میں ان پر لکھتے ہیں اور وہ جب ان مسائل سے سنجیدہ مسائل کی طرف بڑھتے ہیں تو ان کے قلم میں یہی شگفتگی اور دھیما پن برقرار رہتا ہے۔ وہ کسی ہولناکی یا خودکشی کے واقعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دینے کے قائل نہیں۔ خود لکھتے ہیں:

> ''آج کا دور خواب باطل ہونے اور عذاب نازل ہونے کا دور ہے۔ روزگار سے ہتھیار تک، معاشیات سے لے کر منشیات تک سو بلائیں زندگی میں در آئی ہیں۔ دن ختم ہوتا ہے۔ تو شکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ایک اور دن خیریت سے گزرا۔ جب ایسے دن ہوں تو کیا دن کے خاتمے پر آپ اپنے تھکے ہارے قاری کو پڑھنے کے لئے زلزلہ خیز افسانے تھمائیں گے؟ کیا واقعی افسانے اس لیے ہوتے ہیں کہ قاری کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا جائے۔ یہاں تک کہ کاسۂ سر میں اس کا مغز ہل جائے اور وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ آئندہ کبھی کسی کی آبروریزی نہیں کرے گا؟ اس قسم کے افسانہ نگاروں نے یہ کیوں طے کر لیا ہے کہ معاشرے کے سدھار کا سارا بوجھ ان کے ناتواں کاندھوں پر آن پڑا ہے اور وہ یہ کیوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ جب تک افسانے تلاطم برپا نہیں کریں گے، بہو بیٹیوں کی عزت پر ڈاکے پڑتے رہیں گے۔''(۱۳)

ہر ادیب کے سامنے معاشرے کے مسائل ایک سے ہوتے ہیں لیکن منفرد نظر آنے کی خواہش سب میں موجود ہوتی ہے۔ ہر لکھنے والا یہ چاہتا ہے کہ وہ جن موضوعات پر قلم اٹھائے وہ جانے پہچانے تو ضرور ہوں لیکن ایسے ہوں جن پر اب سے پہلے کسی نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اسی لیے رضا علی عابدی کے افسانوں میں بھی ہمیں کچھ ایسے

موضوعات نظر آتے ہیں جن کو غالباً پہلی مرتبہ کسی ادیب نے تخلیقی تجربے کی بھٹی سے گزارا ہے۔'' گریڈ 9 کا سپیرا'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں نیا پن سوچنے کا نیا انداز اور جانا ہوا مگر عجیب مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ لوگوں کے لئے تریاق کا کام کرنے والے سپیرے کس طرح خود ان سانپوں سے ڈسے جاتے ہیں۔اس کہانی میں سانپوں یا سپیروں کی ہی بات نہیں کی گئی بلکہ یہ کہانی اپنے اندر کئی موضوعات کو سموئے ہوئے ہے۔ مختصر یہ کہ رضا علی عابدی نے اپنی کہانیوں میں جن موضوعات کو سمویا ہے وہ روزمرہ زندگی کے معمولات بھی ہیں اور مسائل بھی۔ان موضوعات پر افسانہ نگار نے جس انداز سے قلم اٹھایا ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی سے پیار کرتے ہیں۔انسان کے چھوٹے چھوٹے دکھوں پر سوچتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنے اندر یوں جذب کر لیتے ہیں جیسے وہ ان کی خوشیاں ہوں۔ لیکن ان کا کینوس بہت محدود ہے۔انہوں نے ایک مخصوص ماحول اور مخصوص طبقے کے لوگوں کی نمائندگی کی ہے لیکن اپنے مشاہدے کی وسعت کو پوری طرح اپنے افسانوں میں نہیں برت سکے خود کہتے ہیں:

''ہر کہانی لکھنے کا خیال مجھے کسی اور کی لکھی ہوئی کہانیاں پڑھ کر آیا''۔(۱۴)

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی کہانیوں میں مشاہدے سے زیادہ تخیل سے کام لیا گیا ہے۔ان کے بعض افسانے فکری اعتبار سے اچھے افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ جیسے ''میر صاحب کا پاگل پن'' ''لین حاضر'' انہوں نے ان افسانوں میں معاشرتی رویوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

رضا علی عابدی کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا بجا ہو گا کہ رضا علی عابدی کی بنیادی شناخت ان کے وہ سفر نامے ہیں جو انہوں نے برصغیر کے طول و عرض کے دوروں کے بعد لکھے اور جو بی بی سی سے نشر ہوئے۔ رضا علی عابدی کو شکوہ ہے کہ:

''ہر چند کے میرے افسانوں کے دو مجموعے ''اپنی آواز'' اور ''جان صاحب'' شائع ہو چکے ہیں لیکن جدید اردو افسانے کی جو روایت بھی متعین کی جاتی ہے اس میں میرا ذکر بطور افسانہ نگار نہیں کیا جاتا۔''(۱۵)

رضا علی عابدی نے اس رائے کا اظہار 2004ء میں کیا تھا۔ مگر اس وقت تک ان کے افسانوں کے صرف دو مجموعے منظر عام پر آنے کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ:

''میرے افسانوں پر نہ کسی نے تبصرہ کیا اور نہ ہی انہیں اردو دان دنیا میں پذیرائی ملی اس عدم توجہی نے مجھے باور کرایا کہ شائد افسانہ میرا میدان نہیں''(۱۶)

رضا علی عابدی کے ہاں وُرٹ کے مختلف ڈسپل نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے ان کا افسانہ سادگی اور سادہ لوحی کے باوجود حالات حاضرہ کے تناظر میں ایک نئے انداز میں مختلف ساتھ حالات وواقعات کی منظر کشی کرتا ہے۔ "کہانیاں صرف سادگی اور سادہ لوحی کا اظہار نہیں۔ ان میں بھی انسانی تجربے کی صدیاں سمٹی ہوئی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم REALISM کے چکر میں پڑ کر ان میں پوشیدہ معنہ یاتی خزانوں کو دیکھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔"(۱۷)

یہ درست ہے کہ رضا علی عابدی کے افسانے ان کے سفر ناموں کی طرح مقبول نہیں ہو سکے تاہم ان کے افسانوں میں ایک لوچ، رسیلا پن، گھلاوٹ اور شیرینی ہے۔ ریڈیو سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خطیبانہ انداز میں کہانی کہہ رہے ہیں۔ ایسے موقع پر غیر ضروری تفصیلات ان کے افسانوں میں در آئی ہیں لیکن ان کی اس صلاحیت کا بہر حال معترف ہونا پڑتا ہے کہ قاری ان کی تحریر کے اثر سے نہیں نکلہ تاجب تک وہ مکمل تحریر پڑھ نہ لے وہ شگفتہ اور لطیف پیرائے میں قاری کے اندر ایک تجسس پیدا کرتے ہیں۔ اسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی جمالیاتی حس کو بھی بیدار کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۷۵

(۲) رضا علی عابدی، "میں کیوں لکھتا ہوں اور بھلا کس کے لئے"، مشمولہ جانے پہچانے، کراچی: ذکی سنز پرنٹرز، فروری ۲۰۰۴، ص ۲۵۶

(۳) رضا علی عابدی، اپنی آواز، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳، ص ۱۲۱۔۱۲۲

(۴) رضا علی عابدی سے ٹیلی فونک گفتگو ۱۶ مئی ۲۰۰۴

(۵) حامد بیگ، مرزا، افسانے کا منظر نامہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۶

(۶) رضا علی عابدی، اپنی آواز، ص ۵۷-۶۲

(۷) ایضاص ۱۰۶ - ۹۳

(۸) گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۳۱۵

(۹) سیدہ تحسین فاطمہ، "پہلی بات"، مشمولہ جانے پہچانے، ص ۱۵

(۱۰) رضا علی عابدی، جان صاحب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۴ فلیپ۔

(۱۱) رضا علی عابدی، "افسانہ کیوں لکھا جاتا ہے اور بھلا کس کے لئے"، مشمولہ جانے پہچانے، ص ۲۰۶

(۱۲) "میں کیوں لکھتا ہوں اور بھلا کس کے لئے"، مشمولہ ایضاً ص ۲۵۴

(۱۳) رضا علی عابدی، "میں کیوں لکھتا ہوں اور بھلا کس کے لئے"، مشمولہ ایضاً ص ۲۰۵

(۱۴) رضا علی عابدی سے ٹیلی فونک گفتگو ۲۳ اگست ۲۰۰۴ء

(۱۵) رضا علی عابدی سے ٹیلی فونک گفتگو ۲۷ جولائی ۲۰۰۴ء

(۱۶) رضا علی عابدی سے ٹیلی فونک گفتگو ۱۷ مارچ ۲۰۱۷ء

(۱۷) گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات، ص ۱۹۳